edited

Manoos
Sehsarakin

(بہ سلسلہ مطبوعات طاق بستاں آرہ)

سازِ الم

مانوس سہسرامی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
ایچ ال ین نظامی پرنٹر

۱۹۵۱ء
بار اوّل ۱۰۰۰

اُردو تغزل میں المیہ تاثرات

مانوس سہسرامی

ہندوستان کی مشہور تاریخی شاہراہ جو دہلی سے گذرتی ہوئی "خم جعد بلند" کی طرح بل کھاتی ہوئی تین تین صوبوں کی وادیوں، مرغزاروں اور کہساروں کو طے کرتی ہوئی سرزمین بنگالہ تک پہونچ گئی ہے صوبۂ بہار کے ایک مشہور قصبہ سہسرام سے بھی گذرتی ہے جو اس شاہراہ کے بانی کا مولد! درنہ ہندوستانی بنیاد قتدار کا بھی مرکزی مقام بھی تھا فوجداری اور عدالت دیوانی

ر کے دونوں رخوں پر سڑک کے کنارہ سے جب کوئی سیّاح گذرتا ہے تو وہ عدالت ومقدمہ کے ہنگاموں میں معاشرتی زندگی کے بعض نقوش بھی دیکھتا ہے، ماگھ پوس میں ہرے بھرے خوشنما اور خوش رنگ امرودوں کے ٹوکرے ساون بھادوں میں آموں کی فراوانی، پھاگن اور چیت میں شہتوت کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں، خوانچہ والے شربت، چائے اور کھانے کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں عدالت کی اسی ہنگامہ خیز فضا میں روزی طلب کرنے والوں کے ساتھ ایک جوان سال گرد وغبار میں اٹے ہوئے ژولیدہ مو چاک گریباں، تہمد باندھے، پھٹی پرانی قمیص پہنے، ننگے سر ایک میلی سی چادر بچھائے معطل فاونٹین قلم کی ڈھیر لگائے، پرانی گھڑیوں کے پرزے، پرانے تالے رکھے ہوئے ایک انسان کو بھی آپ دیکھیں گے اگر آپ کی نگاہِ التفات میں کبھی جستجو کی کیفیت پیدا ہوئی، ورنہ

اس منظر میں نہ کوئی خاص کشش ہے نہ اس غبار آلود منتی کے بشرہ میں کوئی خاص رعنائی، ہزاروں انسان روزانہ اس سڑک سے گذرتے ہیں لیکن کم ہی لوگوں کو خبر ہوتی ہے کہ یہاں کا ایک خاکستر نشین دکاندار اپنے خیال کی بلندی، اپنے احساسات کی نزاکت اپنے اعمال کی سادگی اپنی انسانیت کی برتری اور اپنے درد و غم کی قدرتی امانت کے لحاظ سے بستر سنجاب پر محوِ راحت رہنے والوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہے کیا آپ کو یقین آئے گا کہ خاک و غبار میں لدا ہوا یہ مفلوک الحال جوان ایسے پاکیزہ، بلند، اور دل میں پیوست ہو جانے والے اشعار بھی کہہ سکتا ہے۔

مجھے چھوڑئے مرے حال پر میں برا ہوں سب سے برا سہی
یہ گمان کہ ننگ وفا بھی ہوں تو بلا سے ننگ وفا سہی

دیجئے غم اک نیا آپ نہ ہر جفا کے بعد　　کہئے کوئی کہے گا کیا آپ کو ہر جفا کے بعد

مری آرزوؤں کا ذکر کیا یہ رہیں تو کیا یہ مٹیں تو کیا
جنہیں آہ گلشنِ زندگی کی نہ راس آئی فضا کبھی

پردے پردے میں وفاؤں پر جفا کرتے رہے　　اور وہ پھولیں پھلیں ہم یہ دعا کرتے رہے

گرتی ہے برقِ جولاں کیوں بار بار اس پر　　جس گھر کا کوئی گوشہ آباد ہی نہیں ہے

کوئی زندگی ہے یہ زندگی کہ خوشی میں غم کا مزہ ملے
مری سرگزشت نہ پوچھئے کبھی کامیاب ہوا نہیں

گذرتی کیا ہے دل پر اب یہ بلا ہی کے کیا ہوگا
سمجھ کر جو نہ سمجھے اسکو سمجھا ہی کیا ہوگا کیسے

ہیں مثال شعلۂ عشق ہوں ہیں جواب سوز و گداز ہوں
جسے کوئی بھی نہ سمجھ سکا ہیں نہی تو نغمۂ راز ہوں

کوئی نہیں نہیں ہے شکوۂ روزگار کیا
جو ہے انیسِ غم بھی اس کا بھی اعتبار کیا

وار وہ مار رد دل پہ ہے چھٹ گیا تو کچھ نہیں
نغمہ جو نثار کیا دامن ہے تار کیا گو

زینت کا نات کیوں قبر ہو مجھ غریب کی
میں ہی نہیں رہا تو پھر میری یہ یادگار کیا

کتنی سمجھ ہے مختلف اور جدا نظر بھی ہے
دنیا ہمارے حال پہ ہنستی ہے رو رہی مگر بھی ہے

تم بھی تو آئے سن لو شاید یہ آخری ہو
کوئی بیان دل کی رودا د کر رہا ہے

زہ رہ کے حسرتِ دل کروٹ بدل رہی ہے وہ خوگرِ تغافل پھر یاد کر رہا ہے

اتنی ناکامی پہ یہ جوشِ عقیدت الاماں مرکزِ امید پھر وہ آستاں ہونے کو ہے

جھلملا کر بجھ گیا آخر چراغِ آرزو زندگی ہی بن کے صبح مدعا آئی تو کیا

اسی پر ہوئی ختم ساری کہانی ترا آستاں اور میری جبیں ہے

سب سے پہلے مانوس کا ذکر مجھ سے میرے عزیز دوست محمد امیر صاحب نے کیا جو بہ سلسلۂ ملازمت آرہ سے "ناظر محکمۂ فوجداری" بن کر سہسرام پہونچے تھے' امیر صاحب دیوانے تغلق کی طرح "مجمع اضداد" ہیں لیکن ان کے ادبی ذوق اور سب سے بڑھ کر ان کی نگہ نکتہ چیں (جس کو غلطی سے بعض دوستوں نے

"خردہ بیں" سمجھ رکھا ہے، پر انجام کار سبھی کو ایمان لانا پڑتا ہے "انجام کار" اس لئے کہا گیا کہ پہلے پہلے ان کے بعض ادعاؤں سے اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن زمانہ کے پلٹنے کے ساتھ کُفر میں اسلام اور اختلاف میں اتحاد کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہیں، بارہا میں نے ان سے اختلاف کیا لیکن ہر مرتبہ میری ہی ہار ہوئی" یہاں تک کہ اب میں ان کی ادعا، اُن کی تنقید اور اُن کی رائے سے اختلاف کرنے کی بجائے خموش رہتا ہوں یا ہنس کر ٹال دیتا ہوں۔

زندگی، مذہب زمانہ اور اہل زمانہ کے متعلق امیر صاحب کے بعض عجیب و غریب معتقدات ہیں وہ بڑے ملنسار ہیں اور بہت جلد ربط پیدا کر کے اس پر خوشگوار تعلق کا استوار قصر تعمیر کر لیتے ہیں لیکن انسانوں کی کمزوریوں کا اندازہ لگانے شخصیت کے

پر کھنے، اور اس کے خیر و شر کے متعلق فتوی صادر کرنے میں ان کو ایسا ید طولیٰ حاصل ہے کہ انجام کار ہر شخص کو ان کے تنقیدی زاویہ سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہوتی ہے۔

امیر صاحب ہی نے مانوس کا ذکر کیا ان سے ملایا اور اُن کی زندگی، اخلاق اور شخصیت کے متعلق اپنی شوخ فطرت کے لحاظ سے جو کبھی فتوی صادر کرنے سے باز نہیں رہ سکتی ایک اچھوتا بلند اور اٹل فتویٰ صادر کیا، کیسا وہ انسان ہوگا بلند اور خوش نصیب بھی جس کو امیر صاحب کی ژرف نگاہی مان لے۔

مانوس صاحب کا اصل نام الطاف حسین ہے، وہ صرف قالی ہی نہیں بلکہ حالی بھی ہیں لیکن ظہوری کو سلطان ابراہیم عادل شاہ جیسا سرپرست ملا غالب کو اس پر رشک آتا تھا، وہ خود کو اپنے پندار میں ظہوری سے کم نہیں سمجھتے تھے لیکن عادل شاہ کی سخن رسی

اور دریا نوالی ان کی قسمت میں کہاں! اسی طرح حالی کو سر سید جیسا مربی مل گیا اور غالب جیسا اُستاد۔ مانوس کے حال میں ہمیں نہ کسی سخن رس عادل شاہ کا ظلِ عاطفت ہی دیکھنے میں آتا ہے نہ کسی سرسید کا دامن ربوبیت، شخصی سلطنت کا دور گزر چکا۔ اور امارت کا خوان کرم بھی ٹرھ چکا۔ جمہوریت کا دور ہے اور ہندستان آزاد ہو چکا۔ لیکن ہمارا ادب، ہمارا کلچر، اور نوا اور ہمارا غذائی مسئلہ فرقہ پرستی، خود غرضی، اور تنگ نظری کے قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ رہا ہے اس کا زندہ ثبوت آزاد ہندوستان کے ایک شاعر کا یہ دردناک وجود بھی ہے مانوس کی پر درد زندگی کا اثر ان کے ہر شعر میں موجود ہے ان کی زندگی شوپنہار کے لفظ میں ایک روگ ہے اس تلخی کو گھٹانے کے لئے اس جرمن فلسفی کے قول کے مطابق مانوس نے شاعری اختیار کی شوپنہار کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی

تلخیوں کو گھٹانے کے لئے جمالیات بہت اہمیت رکھتی ہے۔

مانوس کا مبلغ علمی ہمارے احسان دانش سے ملتا جلتا ہے

مانوس صاحب عربی فارسی سے تو قطعاً ناآشنا ہیں اردو میں بھی مطالعہ وسیع نہیں، لیکن قدرت کے اس فیضان کو کیا کیجئے کہ علمی تہی دامنی کے باوجود قدرت نے اس کے دل میں ایک ایسی لازوال ہوک تحلیل کر دی جس نے مانوس کو شاعر بنا دیا، اس کی شاعری شمس تبریز اور عراقی کی واردات کی طرح دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز ہے پہلے وہ محسوس کرتا ہے اور پھر بے اختیارانہ یہ احساس صدا بن کر درد مزمن کی طرح دل سے نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ مانوس کے اشعار ذہن و سامعہ پر اپنا گہرا اور دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں دو قسم کے لوگوں کی زندگی حادرجہ انقلاب پذیر رہی ہے وہ یکا یک خاکستر سے لبستر سنجاب پر پہونچے، اور پھر ملبوسات

ریشم و حریر چار بالش حکومت اور کرسی زریں کے بعد یکایک ان کو گدڑیوں، زنداں اور فاقہ مستیوں سے واسطہ رہا یہ انقلاب ان کی حیات میں اتنا سریع السیر رہا ہے کہ ہمیں ماضی اور حال میں عجیب طرح کا ایک تمثیلی منظر معلوم ہونے لگتا ہے، یہ زندگی شاعر کی ہے اور وزیر کی، بالخصوص مشرقی شاعر اور مشرقی وزیر! بادشاہوں نے شاعروں اور وزیروں کو سر بھی چڑھایا اور ان سے خاک بھی چھنوائی، محمد بن الزیات خلیفہ معتصم عباسی کا وزیر بغداد کے ایک تیلی کا لڑکا تھا، ادب نے اس کو وزارت تک پہونچایا اور پھر وزارت نے اس کی جان لی، مشرق کے شاہی خانوادوں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا قابل اور لائق وزیر نظر آتا ہے، جس کی زندگی کا انجام اچھا ہو، ابو الفضل، نظام الملک، عماد الدین الکاتب، جعفر برمکی، محمد الزیات اور جعفر برمکی کی طرح اس کی دردناک موت تو نہ ہوئی، لیکن سلطان صلاح الدین کی وفات کے بعد اس عظیم الشان

وزیر کو زوال اور بدحالیوں سے سابقہ رہا یہانتک کہ ابن خلکان کی روایت کے مطابق وہ خانہ نشین ہو گیا اور زندگی کے بقیہ لمحات شغل تصنیف میں بسر کئے اسی طرح شاعروں کی بدحالیاں سلاطین وامراء کی چشم عنایت سے ترقی و امارت سے بھی بدل گئیں اور یکایک وہ منزل ترقی و جاہ سے خاک و خون میں بھی لوٹتے نظر آتے ہیں یا پھر بلاد و امصار دشت و کہسار کی خاک چھانتے قرینہ ہے مانوس کی زندگی میں بھی ایک انقلاب آئیگا مگر اس انقلاب کے لئے ان کو اپنے اندر صلاحیت بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ وسعت مطالعہ ہے اور کسی ماہر فن کا دائرہ تلمذ!

شاعر اور فلسفی اجتماعی زندگی میں باغی قسم کے انسان ہوتے ہیں، والیٹر مذہب اور ارباب مذہب پر پھبتیاں کرتا، المعری (نابینا شاعر) کو ابن اثیر زندیق لکھ جاتے ہیں ابن باجہ جیسے فلسفی شاعر کو ڈاکٹر ڈی بویر

بجلہ ہیرا ہتا ہے لیکن ابن خلکان کی روایت کے مطابق وہ اسلام، قرآن اور خدا سے استہزا، کرتا تھا اور نور ایمان سے محروم تھا نطشے نے انسان ہی کو الوہیت کے روپ میں دیکھنا چاہا اس کا "مافوق البشر" اس کی اسی اپج کا نتیجہ ہے جوش مذہبیات کے باب میں یا تو ضعیف الاعتقاد ہے یا بے التفات، اس کے لہجہ کی خشونت، مذہب اور ارباب مذہب پر اس کی حد سے بڑھی ہوئی نکتہ چینیاں اس کے شعور مذہبی کی ناپختہ، بیدہ تصویریں ہیں۔ مانوس کے یہاں ہمیں آزاد خیالی اور شعری وسعت کے ساتھ ادبی حلاوت اور نوامیس روح و اخلاق کا بہت ہی پاکیزہ اور معتدل امتزاج نظر آتا ہے، وہ اقبال کی طرح سنجیدہ اور متین ہیں لیکن اقبال کی متانت میں ایک غیر شاعرانہ روکھا پن بھی ہے مانوس کے یہاں ہمیں شوخی اور وسعت نظر آتی ہے اور اس میں اس قدر توازن اور اعتدال ہے کہ ہمیں ان کو ایک خوش ذوق فن کار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اب آئیے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اردو تغزل کے المیہ تاثرات پر ایک غائر نگاہ ڈالیں اور پتہ لگائیں کہ اس صنف میں اردو شعرا نے کتنے نقوش چھوڑے ان کے المیہ تاثرات میں صرف یکسانیت پائی جاتی ہے یا ان میں تنوع، فرق اسلوب، اور اختلاف احساس ہے اور پھر اس اختلاف کے کیا اسباب تھے، مانوس کا تعلق اس صنف کی کس جماعت سے ہے۔

اردو تغزل کے المیہ تاثرات پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پانچ ایسے شعرا نظر آتے ہیں جن کی لے میں ایک خلقی المیہ تاثر پایا جاتا ہے میر، ضیا، قایم، فانی، اور مانوس !

اس سے اتفاق نہیں ہو سکتا کہ ظفر و انشا، شاد و حسرت اور ایک حد تک غالب سے بھی ہماری پلکیں پرنم ہو جاتی ہیں ان کی المیہ لے سے بھی ہم یکجا

متاثر ہوتے ہیں، لیکن میر، ضیا، قایم اور فغانی کی واردات قلب میں ایک خلقی اُبھار پایا جاتا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں محض اپنے ماحول اور جراحت ہستی کے داغ سے متاثر ہو کر نہیں کہتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ زندگی کے متعلق ان کے جنچے تُلے معتقدات تھے انھوں نے انہیں معتقدات کی روشنی میں غزل گوئی کی، اس کا ثبوت ان کے لہجہ کی وہ یکسانیت ان کی لے کا وہ مستقل ٹھہراؤ اور ان کے بیان و اسلوب کا وہ دوامی رنگ ہے، جو شروع سے آخر تک ان کی غزلوں میں متبدل پایا جاتا ہے۔

ظفر، انشا، شاد اور غالب کے یہاں جو المیہ تاثرات ہیں وہ ان کی سرشت کے نقوش نہیں بلکہ زمانے کے اُلٹ پھیر نے اُن کی شاعری کا رخ اور اُن کے رجحان کا دھارا بدل دیا، ان کی شاعری میں وہ فطری سوگ، وہ زہر آسا تلخی، وہ طنز آمیز تبسم، وہ عمیق سوداویت، وہ مستقل کاہش نہیں جو میر، قایم اور فغانی کے یہاں ہمیں نظر آتی ہے ان کے یہاں المیہ

تاثرات اس معصوم نونہال کے ایسے ہیں جو اپنے کھلونے، اپنے لباس اور اپنے چند مسی سکوں پر اترا رہا ہو اور اس سے یکایک اس کا کھلونا، اس کے پیسے کوئی چھین لے اس کا لباس اتار لیا جائے وہ رو پڑے گا اس کی درد بھری چیخ اس کے آنسوؤں کی قطار راہ گیروں کو بھی منہ موڑ کر نہ دیکھنے پر مجبور کرے گی وہ دردمندانہ محبت کے ساتھ بچہ کی دل پرسی کرنے پر مجبور ہو گا لیکن میر، ضیا، قایم اور فانی کی لے ہیں جو نالہ و درد، جو کرب و فغاں، جو حسرت و مایوسی، اور جو کیفیت غم ہے وہ ہمیں اس جوان اور حسین بیوہ کی یاد دلاتی ہے جو شوہر کے دائمی فراق میں کڑھ رہی ہو اور اب اس کا سارا ساز حیات محض ماضی کی یاد سے وابستہ ہو کر رہ جائے، ماہرین نفسیات کا نظریہ ہے کہ غم کی کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان کی خوں شدہ آرزوں کی یاد محض ماضی سے وابستہ ہو جائے مستقبل کے دامان امید سے اس کا کوئی لگاؤ باقی نہ رہے

مانوس کے ناموں میں میرؔ قایم اور فانی ہی کی تلخیاں اور طنز آمیز مسکراہٹیں نظر آتی ہیں، میر صاحب کہتے ہیں،

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے   درد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

یعنی ان کی شاعری ان کی زندگی کی حقیقی کہانی ہے، صرف شاعرانہ سخن سنجی نہیں، اپنی شاعری کے لئے، انہوں نے ادا، اسلوب، رجحان نہیں پیدا کیا، بلکہ ان کے رجحان اور ان کی سرشت نے ان کو شاعر بنایا، ان کی شاعری میں جولے ہے وہ آپ بیتی ہے، میر قایم اور رضیا کے جن اشعار کا میر حسن نے انتخاب کیا ہے وہ بڑی گرانمایہ چیز ہے، میر حسن ہی نے پہلی مرتبہ اپنے تذکرہ میں، میر قایم اور رضیا کا حقیقی رُخ بے نقاب کیا، میر حسن کا تذکرہ ابھی تک اس اعتبار سے اول بھی ہے اور آخر بھی، خود میر نے انتخاب میں ادا اسلوب اور انداز شعری کا لحاظ رکھا، وہ خود کو یا قایم اور رضیا کو حقیقی روپ میں پیش نہ کر سکے،

میر حسن کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے میرؔ، قایم اور ضیا کے متعلق جن خیالات کا اعادہ کیا ہے وہ تنقیدی نہیں بلکہ تحسینی ہیں یا تنقیصی، اور اس حسن و نقص کے امتیاز میں بھی انہوں نے زیادہ تر لطف زبان اور ادائے بیان کا لحاظ رکھا، قایم کے متعلق خود قایم کا تذکرہ (مخزن نکات) بھی ناقص ہے، میر، مصحفی، خلیل، شفیق وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں ہمیں قایم کا حقیقی خط و خال نظر نہیں آتا، تذکرۂ طور کلیم کے مُصنّف سودا سے قایم کے تقابل پر بیجا برافروختہ ہیں اور غصّہ میں سودا کو آسمان کی بلندی پر پہونچا دیتے اور قایم کو زمین کی پستی پر اتار دیتے ہیں وہ اس کے قطعات و رباعیات کے معترف ہیں اور انتخاب دیتے ہوئے اس کے مضامین کو اس کی شوخی فکر پر دال بتاتے ہیں، اور اسی چیز کو قطعاً بھول جاتے ہیں جو قایم کا شیرازۂ حیات شعری ہے یعنی تغزل!

شفیق دکنی نے صرف ڈیڑھ سطر میں قایم کی زندگی لکھی ہے تو انہوں نے کلام کا انتخاب کچھ دیا ہے لیکن حیات اور کلام کے متعلق صرف ان کے "ذہن سلیم اور فکر مستقیم" کے قایل ہیں اور اُن کے "اشعار آبدار" میں ان کو صرف "لطافت" نظر آتی ہے اور ان کا رہیں صرف "ملاحت" یہی ہے قایم کے متعلق شفیق کی تنقیدی کائنات! میر کا تذکرہ ان کے پیش نظر تھا لیکن انہوں نے میر کے اسی فقرہ کو نظر انداز کر دیا جس پر قایم کی شاعری کی بنیاد ہے میر نے ان کو "جوان خیرہ و طیرہ و حسن پرست" لکھا ہے۔ شفیق میر سے متنفید ہوئے ہیں، نکات الشعرا اور تذکرہ گردیزی پر انہوں نے "چمنستان" کی بنیاد رکھی پھر بھی انھوں نے میر کی بلند تنقیدی رائے کو اہمیت نہ دی معلوم ہوتا ہے قایم عہدِ شباب ہی سے "خیرہ سر" تھے اور اُن کی یہ خیرہ سری ساری زندگی قایم رہی، میر حسن نے قایم کا جو انتخاب کیا ہے اس میں ان کی اس خیرہ سری کے

اندر کہیں کہیں تصوّف کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے اور وہ وحدۃ الوجود کے قایل نظر آتے ہیں۔

اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا
جلوہ ہر رنگ میں ہے اس بتِ ہرجائی کا

قایم نے بعض ایسے اشعار کہے ہیں جو زبان کا جزو بن گئے ہیں۔

آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا
دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا

کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا
کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ

قایم کے یہاں ایک ایسی خستگی ہے جس نے ان کو میر کے دوش بدوش لا کھڑا کیا یہ اثر تھا خواجہ میر کے فیض و تلمذ کا بھی، ناز کر زبان میں نار کو رہے کہ پہلے وہ خواجہ میر درد سے اصلاح لیا کرتے تھے،

پھر سودا سے وابستہ ہوئے لیکن خستہ جگری اصلاح و رہنمائی سے حاصل نہیں ہوتی، یہ شاعر کا اٹھان ہوتا ہے قایم کے ایسے اشعار نکات الشعراء طبقات، گلزار سخن، گلشن شعرا وغیرہ میں بہت کم ہیں۔ میر حسن کا تذکرہ اگر نہ ہوتا تو قایم کا اصلی روپ پنہاں رہ جاتا۔

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا
ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

آہ اے پیر چرخ قایم نام
یاں جو رہنا تھا اک جہاں ہی یاد

نہ دل بھرا ہی نہ اب نم رہا ہی آنکھوں میں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہی آنکھوں میں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں
یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

بعد خط آنے کے اس سے تھا وفا کا احتمال　　لیکن واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

یاں سدا اندیشہ بلا وقفہ جگر ریشی ہے　　کیجئے کیا جان مری عالم درویشی ہے

کسے گلگشت گلشن کی ہوس ہے　　اسیری کا جگر پر داغ بس ہے

نہ مرنے دیتے ہم قایم کو لیکن　　خداوندی سے کچھ چارہ نہیں ہے

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی　　اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

خلیل نے جس انداز سے قایم کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے میر حسن کے بعد خلیل ہی نے قایم کے رنگ تغزل کو اہمیت سے لکھا۔ خلیل نے میر حسن کے تذکرہ سے پورا استفادہ

کیا ہے اور انتخاب کلام میں تو گویا وہ میر حسن کے مرہون منت ہیں۔

میر ضیا دہلی کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں بھی قیام رہا پھر عظیم آباد میں بس گئے میر تقی سے ان کی شاگردی کا تذکرہ صرف مصحفی نے کیا (تذکرہ ہندی گویاں) میر صاحب نے ان کو "مودب" مہذب متواضع لکھا ہے اور پھر "با فقیر ربطے بسیار دارند" بھی فرماتے ہیں اس سے مصحفی کی روایت کی ایک حد تک تصدیق ہوتی ہے۔

لہ تقریباً ۱۱۹۲ھ میں (جو تذکرہ میر حسن کی تالیف کا زمانہ ہے) میر ضیا عظیم آباد چلے آئے تھے اور راجہ شتاب رائے کے یہاں ٹھہرے یہ خانوادہ اپنے بلند ذوق ادب کے لئے مشہور رہا ہے یہیں شیخ علی حزیں بھی آکر ٹھہرے تھے، راجہ شتاب رائے کے لڑکے نے میر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا میر ضیا کنور صاحب کو اصلاح بھی دینے لگے بہار کے شعرا نے میر صاحب کی طرف توجہ کی اور ان سے استفادہ کیا (ع۔م)

ضیا پر میر کی قنوطیت کا گہرا اثر ہے ان کے یہاں سوز و گداز
بیں بڑا جوش ہے میر حسن نے لکھا ہے کہ ضیا بڑے درد مند انسان تھے
جس سے یہ درد شعر سنتے محظوظ ہوتے اور روتے گویا ضیا کی زندگی
ہی ایک دردمندانہ 'حال" تھی، میر حسن کو ضیا سے شرف تلمذ بھی تھا'
ضیا کے ان چند اشعار سے اُن کے ذوق' رجحان اور طرز کا پتہ چلتا ہے:

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کمھلانے لگا

میں نے کل پوچھا ضیا سے دل کو کیا پھر کھو دیا اس نے کوچے کو ترے تبلا کے ٹک ڈھ ہی رو دیا

جوں چنار اپنی جا نہ پھولے ہیں نہ پھل لاتے ہیں ہم جب مرا داپنی کو پہونچے ہیں تو جل جاتے ہیں ہم

مجھ سا بندہ نہیں خدائی میں ہاتھ سے اے صنم نہ کھو مجھ کو

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا — ہم ترے جی سے ایسا بھول گئے

یہ ماتم کس دوانے کا ہے یارب آج صحرا میں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اڑاتے ہیں

جلد ہی ضیا خبر لے آتی ہی تجھ جگر سے — آواز ناتواں سی دل کے کراہنے کی

روویں ہم بزمیوں کو کیا اپنے دنوں کے پھیر ہیں — شمع محفل تھے جو کل سو راکھ کے اب ڈھیر ہیں

ضیا کیا درد مزمن ہی ترے دل میں میاں سچ کہہ — کہ جب تو بات کرتا ہی تو ٹھنڈی سانس بھرتا ہی

گریباں وخاک اڑاتا جوں ابر جوں بگولا — صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا بھی دیکھا

کبھی جا گُل کو دیکھے ہیں کبھی دیکھے ہیں نرگس کو
خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہیں ڈھونڈتی کس کو

ہم نہ مُثمر نہ ہم نہال ہوئے
لگتے ہی ہم تو پائمال ہوئے

کیا کہا قاصد صبا سنتے ہی جس کے مر گیا
بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

میر پر بھی بہت کچھ لکھا گیا اور فانی پر بھی لیکن میر کے تیکھے پن اور فانی کے "جی چھوڑ دینے" میں بڑا فرق ہے میر کی شاعری میں بھی درد و قنوط ہے اور فانی کے یہاں بھی لیکن میر کی انفرادیت اور فانی کی شخصیت مماثل بھی ہیں اور جداگانہ بھی، ان کے کلام میں اسی طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے جس طرح ایک ماں باپ کے توام بچوں میں جن کی شباہت کا سرسری جائزہ ناواقف لوگوں کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ ان کے خط و خال میں کتنے واضح امتیازات ہوتے ہیں؛

"باقیاتِ فانی" پر رشید احمد صدیقی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے صدیقی صاحب ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم میں سے ہیں اور ان کے یہاں نگارش بیان کا ایک خاص طرز ہے جو بہت محبوب بھی ہے اور ممتاز بھی، رشید صاحب نے "باقیات" پر پورے بہتر صفحات میں مقدمہ لکھا اور اس میں شعریت، شاعری، شاعر اور آرٹ پر اپنی تحقیق و تنقید پیش کی اس سے ہمیں فی الحال بحث نہیں رہ گیا خود فانی پر تبصرہ تو اس کی موزونیت یا ناموزونیت کے لیے خود رشید صاحب کا فیصلہ کافی ہے جو مقدمہ کے آخری سطور میں پایا جاتا ہے ہندوستان کے بے مثل ادیب اور پایۂ ناز نقاد حضرت نیاز فتحپوری نے اپنی تحریروں میں رشید صاحب کو بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا ہے گو بعض جگہ ان کے خاص رنگ کے اضمحلال کی طرف بھی اشارے کئے ہیں، نیاز صاحب کی ان الہامی رایوں سے اختلاف کی گنجائش نہیں، لیکن "باقیات" میں رشید صاحب

ان پھلجھڑی کے مثل نظر آتے ہیں جس میں مسالہ کم ہو اور وہ کچھ وقفہ دے دے کر چلے اور پھر یکایک بھک سے ہو کر رہ جائے' رشید صاحب کا انداز ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ فانی پر زور صرف کریں' اور اگر کریں تو بے جا بھی ہوگا اور بے مزہ بھی' اسی طرح جس طرح ریاض نے فانی کی مشہور غزل "چلے بھی آؤ یہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ" پر غزل لکھی اور شعر کے ساتھ ساتھ اپنی بھی ہٹی پلید کر گئے' ریاض کے چلبلے انداز اور حسن بیان سے کس صاحب ذوق کو انکار ہوگا لیکن فانی کے تتبع میں انھوں نے جو غزل لکھی اس کو ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے رشید صاحب کا حقیقی رنگ وہی ہے جو "سرود وبستان" کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کی تنقیدی قوت بھی ہے اور زور بیان بھی' فکر واحساس کی وضاحت بھی اور ان کا خاص دلکش سٹایل بھی' اگر اسی رنگ میں وہ پورا مقدمہ لکھ ڈالتے تو بھی اردو ادب میں ایک چیز ہو جاتی' گو یہ فانی پر مقدمہ

تو نہ ہوتا لیکن اس لمبی فرسودہ نگاری سے تو انھوں نے ریاض کی طرح اپنے دامن کمال پر بھی دھبے ڈال لئے اور "باقیات" کا مطالعہ کرنے والوں پر بھی پتھر کے چٹان لڑھکائے،

فانی شاعر تھے لیکن غالب کے فن، انداز اور اسلوب سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہیں یہاں تک کہ میر کے قنوطی انداز بیں جو بلیغ شعریت اور شاعرانہ فن ہے وہ بھی فانی کے یہاں بہت کم ہے، میر بھی واردات قلب بیان کرتے ہیں اور فانی بھی لیکن میر کے بیان میں فن کا کمال بھی ہوتا ہے اور اسلوب کی دل آویزی بھی، غالب اس باب میں بہت بڑھا ہوا ہے لیکن قدرت نے واردات سے اس کو اس قدر فیضان نہیں پہونچایا تھا میر کے یہاں تنوع ہی معانی اسالیب اور بدایع کا، اس کے برخلاف فانی کے یہاں یکسانیت زیادہ اور تنوع کم ہے البتہ پیرایۂ بیان میں جدت طرازیاں ہیں،

اللہ اللہ اک دعائے مرگ کے دو دو اثر   واں کھلا باب اجابت یاں قفس کا در کھلا

اُف اس آزادی بے ہنگام کی مجبوریاں   ہیں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا ہوں پر کھلا

فانی کے یہاں ایک فن کارانہ اشارہ پایا جاتا ہے میر کے یہاں بھی اس انداز کے اشعار ہیں:

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا   بیچارہ گریہ ناک دگر یاں دریدہ تھا

یہاں واردات کے ساتھ فن ہے جادت ہے معنی آفرینی ہے میر کے لیے غم سرمایہ زندگانی ہے غم کی دُنیا ہی ماضی کی یاد سے وابستہ ہوتی ہے فانی کے یہاں موت زندگی کا سہارا ہے اور روح کے لئے پیغام اجل بھی اس لئے فانی کی آرزوئیں محض ماضی سے لگاؤ نہیں رکھتیں بلکہ ان کا تعلق مستقبل سے بھی وابستہ ہے اس کے برخلاف میر کے یہاں کوئی سہارا ہی نظر نہیں آتا' وہ اس چھوٹی سی کشتی کے مثل ہیں جو بحر کے تلاطم اور امواج کے زیر و بم میں ناخدا کے

سہارا اسے بھی محروم ہوا اور ہوا کے تند جھونکوں اور سمندر کے تھپیڑوں نے اس کو تجربے پایاں میں اتنی دور پہونچا دیا ہو جہاں سے ساحل کا منظر بھی اوجھل ہو جائے اس فرق و امتیاز کے ساتھ فانی کو میر کے ساتھ بھی ہم آہنگی رہا ہے اور قایم وضیا کے ساتھ بھی۔

فانی کے ان اشعار میں میر کی طرح کتنی گہری چبھن ہے،

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دست جنوں کو کیا کہئے

اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزل عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی

تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

پوری غزل میں فانی کے پاس انگیز تاثرات بھرے ہوئے ہیں

اور مقطع میں تو گویا انہوں نے جان ڈال دی ہے،

مانوس نے بھی فانی کی غزل "بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا" پر غزل کہی ان کے اس مجموعہ میں یہ غزل موجود ہے، دونوں کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔ اگر مانوس صاحب نے فانی کی غزل پیش نظر رکھ کر اپنی غزل کہی ہے تو بھی ان کا بڑا کمال ہے اور اگر ان کی نظر سے فانی کی غزل نہیں گذری تو ان کے کمال پر حیرت آتی ہے، بہر حال مانوس کی غزل فانی سے بڑھی ہوئی ہے مانوس کے بیان میں اتنا جوش ہے کہ معلوم ہوتا ہے بقول غالب "رگ سنگ سے شرار کی جگہ خون ٹپک رہا ہے اور وہ تھم نہیں رہا ہے"۔

مانوس صاحب نے جگر کی غزل پر بھی غزل کہی ہے جگر کی یہ مشہور اور بڑی کامیاب غزل ہے "چاہ کئے جا رہا ہوں میں گناہ کئے جا رہا ہوں میں" لیکن مانوس کی غزل اپنی جگہ رہتی اور حسرت سنجی کے

لحاظ سے بہت ملیتہ بھی ہے اور منفرد بھی'

ہمیں میر بہت محبوب ہیں اور اسی لیے ہم ضیا، قایم، فانی اور پھر مانوس سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں' ہم نے شوپنہار کی کتاب "عالم بہ حیثیت مشیت و لصور" پڑھی تو اس میں بڑا مزہ ملا افلاطون شاعر فلسفی تھا جس طرح اقبال اور ابن باجہ فلسفی شاعر' شوپنہار کے یہاں بھی ہمیں شعر و فلسفہ کا ایسا ربط نظر آتا ہے کہ کہیں میر یاد آتے ہیں کہیں انگلستان کا مشہور ناول نگار ہارڈی' میر' شوپنہار اور ہارڈی کا زاویہ نگاہ کائنات' زندگی اور حوادث کے متعلق ملتا جلتا ہے' فرق صرف یہ ہے کہ شوپنہار اور ہارڈی "جبریہ" نظر آتے ہیں اور میر کے یہاں جبر کے ساتھ صوفیانہ تسلیم و رضا بھی پایا جاتا ہے یہ جرمن فلسفی خالق کائنات سے خوش نہیں' اور یہ انگریز داستان گو بھی اس کی طرف سے جیں بہ جبیں ہے' شوپنہار مشیت کو "اندھی" بتاتا تھا' اور ہارڈی کائنات

میں ایک غیر مرئی، بے فیض، لاابالی، ناقابل ادراک "حضور" پاتا تھا یہی وہ طاقت ہے جس سے انسان یکہ و تنہا نبرد آزما ہے وہ دوسرے انسانوں سے نزاع میں مشغول نہیں ہے بلکہ انسانیت کے اس مشترک دشمن سے جو ہر جگہ موجود ہے" ہارڈی کا عقیدہ تھا کہ مصیبت کائنات کا ایک اصول ہے اور یہ بلا امتیاز ضعیف و قوی پر یکساں نازل ہوا کرتی ہے، نہ عقل کے زور سے اس کو رد کیا جا سکتا ہے نہ حماقت کی بدولت اس کا حادث ہوتا ہے اس کا حادث قطعی ہے اور پھر اتفاقی بھی کیونکہ یہ ایک غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے ایک ایسی غلطی کا جس کی اصلاح انسان کے بس میں نہیں کیونکہ وہ اس کا خالق نہیں اس کو خالقِ کائنات نے بنایا" اس لحاظ سے ہارڈی تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بالکل جبریہ فرقہ کا پیرو معلوم ہونے لگتا ہے میر، قایم، ضیا، فانی، مانوس سب کے یہاں یہ جبریہ عقاید ہمیں نظر آتے ہیں وہ بھی مقدر کے قایل ہیں لیکن وہ شوپنہار اور ہارڈی کی طرح خالق ہی پر نکتہ چینیاں کرنے اس کو ایک مستبد حکمراں ٹھہرانے

کے بدلے اس کی مشیت کے سامنے سپردگی سے کام لیتے ہیں، گو اضطراراً نالہ کشی بھی کر رہے ہیں اور گلہ پردازی بھی"۔

عبدالمالک آروی

طاق البستان ملکی محلہ آرہ
۲۶ مئی سنہ ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کوئی نہیں، نہیں سہی شکوۂ روزگار کیا
ہے جو انیسِ غم ابھی، اس کا بھی اعتبار کیا

جینے نہ دے گی چین سے ہائے نگاہِ یار کیا
دل کی فضا اداس ہے، ختم ہوئی بہار کیا

شکوۂ زندگی غلط، دل کی امید بھی غلط!
میں ہی نہیں نظر میں جب پرسشِ حالِ زار کیا

یوں ہی فضا اداس تھی اور اداس ہو گئی
تازہ پیام دے گئی دل کو نگاہِ یار کیا

شامتِ غم سے زندگی قابلِ رحم ہے مگر
غیر کے ساتھ آپ بھی ہنستے ہیں بار بار کیا

دار و مدار دل پہ ہے، بیٹھ گیا تو کچھ نہیں!
نغمۂ جوئبار کیا، دامنِ کوہسار کیا

سن کے کرے گا کوئی کیا، کہہ کے کسی سے ہوگا کیا
رو رو کے ماجرائے غم کہتے ہو بار بار کیا

زینتِ کائنات کیوں فکر ہو مجھ غریب کی
میں ہی نہیں رہا تو پھر میری یہ یادگار کیا

کوئی امید ہی نہیں، لاکھ دعائیں کیجئے
گلشنِ دل اجڑ گیا آئے گی اب بہار کیا

میں مثالِ شعلۂ عشق ہوں میں جو اب سوز و گداز ہوں — جسے کوئی بھی نہ سمجھ سکا میں وہی تو نغمۂ راز ہوں

کبھی طور پر کبھی دار پر کبھی قم کے نالۂ درد میں — نظر آئیں جس میں حقیقتیں وہ مجاز ہوں مجاز ہوں

وہ ضیائے حسن میں بھی کشش جسے دیکھتے ہی میں کھو گیا — جسے خود ہی میں نہ سمجھ سکا، میں کسی کا پردۂ راز ہوں

مجھے دیکھے وہ جو کلیم ہو مجھے ہونٹ وہ جو خلیل ہو — کبھی شعلہ زن ہوں میں طور پر کبھی جلوۂ رخِ ناز ہوں

کوئی اس کے دل سے بھی پوچھتا کبھی عمر بھر جو ہنسا نہیں — جسے اب تو وہم یہ ہو چلا ہے کہ میرا کوئی خدا نہیں

وہ مذاقِ عشق بدل گیا، وہ نگاہِ حسن بدل گئی — اسے کیا کروں کہ پنہ اب کوئی چیز غم کے سوا نہیں

کوئی زندگی ہے یہ زندگی کہ خوشی میں غم کا مزہ ملے — مری سرگزشت نہ پوچھئے، کبھی کا بیاں ہوا نہیں

وہی دل جو کل سے خموش تھا، وہ جہاں سے آج گزر گیا — دمِ واپسیں تری یاد نے بھی کسی کا ساتھ دیا نہیں

وہ مذاقِ عشق نہیں رہا، وہ کہاں تصورِ زندگی — جو مزہ ملا ترے ہجر میں کبھی لطف میں بھی ملا نہیں

وہ حسین دور گزر گئے تری چشمِ لطف تھی اور ہم — ہیں عجب طرح کی یہ وحشتیں کہ سکونِ دل کو ذرا نہیں

گزرتی کیا ہے دل پہ لب پہ لا ہی کے کیا ہوگا — سمجھ کر جو نہ سمجھے اس کو سمجھا ہی کے کیا ہوگا

کرم کیسا عنایت کیا، تخاطب بھی نہیں ہوتا — اب اس کے سامنے یہ ہاتھ پھیلا ہی کے کیا ہوگا

نہیں ہے صبر گر ممکن تو سر بھی پھوڑ کر دیکھو — مصیبت ٹل نہیں سکتی ہے گھبرا ہی کے کیا ہوگا

ہری اپنی کی مانوس کھیتی ہو نہیں سکتی
بجائے آنسوؤں کے خون برساہی کے کیا ہوگا

مجھے چھوڑ دیجئے مرے حال پر، میں برا ہوں سب سے برا سہی
یہ گماں کہ ننگ وفا بھی ہوں تو بلا سے ننگ وفا سہی

ہے بہت بلند نظر مری، مجھے اپنے عشق پہ ناز ہے
اگر اور بھی ہو کوئی ستم تو یہ شوق بعد فنا سہی

ہو مصیبتوں میں گھرا ہوا، غم زندگی ہے عذاب جاں
نہ کرے گی دل پہ اثر ذرا، یہ شراب ہوش ربا سہی

یہی آرزو ہے تو فکر کیا، میں ہوا ہوں خلق اسی لئے
وہ ستم جو پہلے روا نہ تھے، ترے عہد میں وہ روا سہی

مجھے میکدے سے غرض نہیں، مجھے تیری چشم کرم ہے بس
مرے واسطے تو یہ زہر ہے، مے ناب آب بقا سہی

پردے پردے میں جفا دل پر جفا کرتے رہے
اور وہ پھولیں پھلیں، ہم یہ دعا کرتے رہے

زندگی کا مرثیہ یہ حسرتوں کا خون کیا
ہم گنہگارِ وفا، شرحِ وفا کرتے رہے

ہر ستم کا خیر مقدم کرنا اٹھتے بیٹھتے
فرض تھا یہ اک محبت کا ادا کرتے رہے

کیوں نہ کرتا ہم پہ آوازے حریفِ زندگی
کشتیٔ دل ہم سپردِ ناخدا کرتے رہے

کاش! اس کم ظرف ہی کی داد تو دیتا کوئی
جو نظر انداز لطفِ ماسوا کرتے رہے

لکھنے والے لکھ چکے مانوس اک غم کی کتاب
ہم مرتب ابتدا و انتہا کرتے رہے

مری آرزوؤں کا ذکر کیا، یہ رہیں تو کیا، یہ مٹیں تو کیا
جنھیں آہ گلشنِ زندگی کی نہ راس آئی فضا کبھی

مجھے اپنے دل پہ ذرا بھی اب نہیں اعتماد یہ حال ہے
ہے رہینِ لطفِ جفا کبھی، ہے شہیدِ جوشِ وفا کبھی

وہ مے نشاطِ چمن کہاں؟ یہ نصیب مشقِ ستم کہاں؟
مری تشنگی نہ بجھا سکی، یہ شراب ریز ہوا کبھی

یہ مٹے بھی جلوہ خدا کرے، یہ نشان لوحِ مزار کیا
نہ تو کوئی آیا گیا کبھی، نہ چراغ جس پہ جلا کبھی

گریۂ پیہم سے کوئی بار گماں ہونے کو ہے ۔۔۔ مختصر سی یہ کہانی داستاں ہونے کو ہے

حسن کی نیرنگیوں کا ہو چلا دل پر اثر ۔۔۔ پھر کوئی بیگانۂ کون و مکاں ہونے کو ہے

اب خدا کے ہاتھ ہی ہے آبروئے زندگی ۔۔۔ عشق میں دل کا مسلسل امتحاں ہونے کو ہے

دیکھنے والے مری بیچارگی پر رحم کھا ۔۔۔ نذرِ طوفانِ حوادث آشیاں ہونے کو ہے

اتنی ناکامی پہ یہ جوشِ عقیدت الاماں! ۔۔۔ مرکزِ امید پھر وہ آستاں ہونے کو ہے

آپ بھی تشریف لاتے کاش رسمی طور پر ۔۔۔ جب شریکِ بزمِ ماتم اک جہاں ہونے کو ہے

پھر خدا حافظ محبت میں سکون و صبر کا ۔۔۔ پھر کسی کی یاد دل میں میہماں ہونے کو ہے

سوئے دل مانوس ہے پھر وہ نگاہِ خشمگیں

پھر بہارِ آرزو نذرِ خزاں ہونے کو ہے

دیجیے حکم اک نیا آپ نہ پچھتائیے بعد ۔۔۔ کہئے، کوئی کہے گا کیا آپ کو پھر خدا کے بعد

آپ ہی کہہ کے حالِ دل تلخیٔ زیست بڑھ گئی ۔۔۔ اور بُرا غریب کا حشر ہوا دعا کے بعد

جانِ غریب عمر بھر مرکزِ غم بنی رہی ۔۔۔ ہو ہی رہے گا کچھ نہ کچھ صبر کی انتہا کے بعد

بلا سوچے سمجھے ستم کر رہے ہو سمجھتے ہو جیسے خدا ہی نہیں ہے
اسی پر ہوئی ختم ساری کہانی ترا آستاں اور میری جبیں ہے
یہ ہر گام پر ٹھوکریں کھا رہا ہے سمجھتے تھے دل کو بڑا دور بیں ہے

جلووں سے رسم و راہ کیے جا رہا ہوں میں جشن دل و نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
آنکھوں سے دل کا خون ٹپکتا ہے رات دن تعمیل حکم آہ! کیے جا رہا ہوں میں
آنکھوں کے سامنے ہے جنازہ امید کا پھر بھی کسی کی چاہ کیے جا رہا ہوں میں
دنیا کی راحتوں کا تصوّر بھی جرم ہے ایثار بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں
مجبور زندگی ہوں مرا حال کچھ نہ پوچھ! ہر لحظہ اک گناہ کیے جا رہا ہوں میں
وہ زندگی کہ جس پہ فرشتوں کو ناز تھا آلودۂ گناہ کیے جا رہا ہوں میں
دیکھا ہے لاکھ بار مگر اضطراب میں
مانوس پھر نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

اُس نے مجھے رکھا یوں محروم جفا برسوں دی ہر دے ہی پردے ہیں تعلیم وفا برسوں
دنیائے محبّت کی پھر بھی نہ فضا بدلی کس کس کو نہیں اپنا سمجھا ہے خدا برسوں

کس طرح کروں ظاہر الفاظ نہیں ملتے ‏ ‏ ‏ ان آنکھوں نے دیکھی ہیں جو بھی فضا برسوں

اللہ رے غلط فہمی اللہ رے خود بینی !

ناحق وہ رہے مجھ سے مانوسؔ خفا برسوں

مجبورِ عشق وقفِ بیداد ہی نہیں ہے ‏ ‏ ‏ قہرِ ستم کی کوئی میعاد ہی نہیں ہے

گرتی ہے برقِ جولاں کیوں بار بار ان پر ‏ ‏ ‏ جس گھر کا کوئی گوشہ آباد ہی نہیں ہے

معیارِ زندگی ہے، یہ دورِ زندگی کا ‏ ‏ ‏ بیدادِ اب کسی کی بیداد ہی نہیں ہے

کب حوصلہ کیا ہے اظہارِ آرزو کا ‏ ‏ ‏ جب قابلِ سماعت فریاد ہی نہیں ہے

اللہ جانتا ہے کیا زندگی ہے دل کی

مانوسؔ یہ ستم کش برباد ہی نہیں ہے

صرف ناکامی ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ‏ ‏ ‏ آہ! لے آئی مجھے یہ حسرتِ منزل کہاں

کون سا در ہے جہاں سے میں نہ ٹھکرایا گیا ‏ ‏ ‏ پھر مجھے لے جا رہا ہے اضطرابِ دل کہاں

ڈوبنے والے تخیل کی ہیں یہ رنگینیاں : ‏ ‏ ‏ حلقۂ گرداب میں ہے تو ابھی ساحل کہاں

اتنی آوارہ خرامی، اتنی ناکامی کے بعد۔ ‏ ‏ ‏ آہ! پھر لے جا رہی ہے سعئی لاحاصل کہاں

زندگی کا لُطف جس کے دم سے تھا جاتا رہا
مُردہ دل پہلو میں ہے، مانوس زندہ دل کہاں

جیسی بھی مصیبت آیا کی ہر حال میں استقبال کیا
مجبورِ محبت ہوں لیکن خودداریٔ دل بدنام نہیں
رونے کا کوئی حاصل ہی نہیں، تسکین ذرا ہو جاتی ہے
برسوں ہوئے آنکھیں خشک ہوئیں آنسو کا کہیں بھی نام نہیں
مایوس نظر، پامالِ جفا، مرنے کی دعائیں شام و سحر
دعوائے محبت جھوٹا ہے، شاید یہ غلط الزام نہیں
ہر دور کو آنکھوں نے دیکھا، اب کے تو خدا ہی حافظ ہے
ہاں چند لہو کے قطرے ہیں دل کا تو کہیں بھی نام نہیں
دنیائے مسرت فی الواقع عبرت کا مرقع ہوتی ہے
گر ذوقِ نظر محدود نہ ہو، کوئی بھی بُرا انجام نہیں
سامانِ فریبِ دل یہ نہیں تو اور اسے کیا کہتے ہیں
پیغام مسرت دھوکا ہے، دنیا میں کہیں آرام نہیں

رہ رہ کے دل کسی کو پھر یاد کر رہا ہی — سرمایۂ سکوں کو برباد کر رہا ہی

کن کن مصیبتوں کا ہوتا ہی سامنا پھر — اسباب وہ فراہم صیاد کر رہا ہی

تم بھی تو آ کے سن لو، شاید یہ آخری ہو — کوئی بیان دل کی روداد کر رہا ہی

مایوسیوں کا مارا مرکز سے ہٹ نہ جائے — تنگ آ کے زندگی سے فریاد کر رہا ہی

رہ رہ کے حسرتِ دل کروٹ بدل رہی ہے — وہ خوگرِ تغافل پھر یاد کر رہا ہی

میں ہی سمجھ رہا ہوں، جو کچھ گزر رہی ہی — کس کس طرح کوئی اب بیداد کر رہا ہی

باتوں میں آ گیا ہی اس بے وفا کی کوئی — پھر حسرتوں سے دل کو آباد کر رہا ہی

کتنی سمجھ ہی مختلف اور حدِ نظر بھی ہی — دنیا ہمارے حال پر ہنستی ہی نوحہ گر بھی ہی

غم کا ہر ایک چیز پر چھایا ہوا اثر بھی ہی — میری ہی طرح مضطرب شام بھی ہی سحر بھی ہی

یہ بھی ہی کوششِ فضول چھوڑ کے سر کریگا کیا — قابلِ سنگِ در نہیں ہونے کو یوں تو سر بھی ہی

نوحۂ زندگی ہی یہ سن کے کوئی کریگا کیا — آہ! شہیدِ آرزو دل بھی ہے اور جگر بھی ہی

کشتیٔ اُمید۔ دل جب پارہ ہو گئی — راہِ بحرِ غم میں سعیٔ ناخدا آئی تو کیا

ہیں کہاں وہ گردشِ پیمانۂ رنگیں کہاں — بزمِ ساقی میں شرابِ غم رُبا آئی تو کیا

جھلملا کر بجھ گیا آخر چراغِ آرزو / زندگی ہی بن کے صبحِ مدعا آئی تو کیا
تختۂ مشقِ ستم بننا تھا جن کو بن چکے / یاد اب بھولی ہوئی رسمِ وفا آئی تو کیا
دل کو اک عرصہ ہوا بزمِ جہاں چھوڑے ہوئے / اب اگر بہرِ تلافی ہی قضا آئی تو کیا

داد ظرفِ غم کی جب مانوں جیتے جی نہ دی
اب انھیں اپنی جفاؤں سے حیا آئی تو کیا

ہنوز ہے مجھے تسکینِ اضطراب کہاں / ہوئی ہے غم کی مکمل ابھی کتاب کہاں
امینِ دفترِ حسرت، دلِ خراب کہاں / ابھی یہ پہونچی ہے تکمیل کو کتاب کہاں
چراغِ راہِ محبت، کلیدِ بابِ حیات / حدیثِ حسن سے بڑھ کر کوئی کتاب کہاں
جدا نہیں کوئی عالم یہ دونوں عالم سے / تو پھر شہود ہے یہ آپ کا حجاب کہاں
شہیدِ درد، شہیدِ ستم، شہیدِ وفا / مرے سوا یہ کسی کو ملا خطاب کہاں

قدم قدم پہ خیالوں کا اک نیا عالم
وہ الجھنوں کا زمانہ، وہ اضطراب کہاں

دن بیت رہے ہیں، آس بھی ہے، وہ صبح کہاں، نہ شام کہاں
پھر حُسن کی شایاں جیت ہوئی، اس دور میں بھی آرام کہاں

اُمید کی دُنیا میں لاکھوں ارمانوں کی قبریں بنتی ہیں
بیگانۂ جورِ شام و سحر، معلوم ابھی انجام کہاں

کب محفلِ دل برباد ہوئی، یہ یاد نہیں سب بھول گئے
تسکین بھی جس سے تھوڑی بہت، اب وہ بھی شکستہ جام کہاں

وہ عہدِ محبت کی باتیں، اُمید یہ دھوکا دل کو نہ دے
برسوں ہوئے رشتہ ٹوٹ گیا، آتا ہے کوئی پیغام کہاں

اب حُسنِ نظر کی راہ بُری، اس جان کی گاہک ہو نہ کہیں
تاریکیٔ قسمت چھائی ہے، خاموش سوادِ شام کہاں

جینے کی تمنا میں کیا کیا، مرنے کی تمنا رہتی ہے
پہلو میں ہے کوئی چیز مگر مانوس دلِ ناکام کہاں

معلوم نہ تھا افسوس! یہ دلِ بیگانۂ منزل نکلے گا
کیا سعیٔ مسلسل کا میری اب کچھ بھی نہ حاصل نکلے گا

اخلاص و عقیدت کی قیمت اس دور میں کیا ہی سمجھو گے؟

مایوس کسی کی بزم سے جب فریاد کناں دل نکلے گا
اب اپنی نظر کو کیا کہیے، انجام تمنّا لاحاصل!
سمجھے تھے جسے سب کچھ ہی یہی، وہ نقش بھی باطل نکلے گا
انجام کی بھی پروا نہ رہی اللہ رے نظر معلوم نہ تھا
مانوس بھروسہ تھا جس پر، وہ رہزنِ منزل نکلے گا

کوئی ہمدم ہی نظر آتا نہیں اب دل کے بعد
ہیں بہت سی منزلیں مانوس اس منزل کے بعد
تا کجا اے بے خبر ہنگامۂ یاس و اُمید
اور بھی اک بزم ہے اس بزمِ آب و گل کے بعد
گو بظاہر ولولے دل کے ہیں تمہیدِ نشاط
نذرِ غم ہو جائیں گے سب حسرت بسیار کے بعد
اس ستم کی داد ہم مانوس کیا دیتے انھیں
امتحانِ زندگی کیا؟ امتحانِ دل کے بعد

عشق میں شکوہ زباں پر لائیں کیا
جو ہوا اچھا ہوا، پچھتائیں کیا
اے دن تازہ مصیبت آئے گی
بات گھبرانے کی ہے گھبرائیں کیا

جس کی قسمت ہی ازل سے ہو بُری
آپ ایسے پر کرم فرمائیں کیا
دل کی دُنیا مٹ گئی، دل مٹ گیا
اس سے زیادہ آپ کو سمجھائیں کیا
آپ سمجھائے تو ہیں مانوس کو
اور ہم سمجھائیں تو سمجھائیں کیا

ترس ترس کے رہا عمر بھر سکوں کیلئے
جفائے کشمکشِ روزگار نے مارا
اُمید ہی پہ گزاری ہے زندگی اتنی
فریبِ حُسنِ تغافل شعار نے مارا
بڑی اُمید تھی جس پر بڑا بھروسہ تھا
ستم تو یہ ہے اسی رازدار نے مارا
سوائے صبر کے مانوس کیا کرے کوئی
فریبِ زندگیٔ خوش گوار نے مارا

محبّت کی حکایت دربیاں لائی نہیں جاتی
محبّت میں محبّت کی قسم کھائی نہیں جاتی
تمنّاؤں میں کیا کیا حُسن پیدا غم سے ہوتا ہے
خزاں دیدہ سہی، پھولوں کی رعنائی نہیں جاتی

سیہ بختی وہاں لائی ہے مجھ آفت رسیدہ کو
جہاں امید کی کوئی جھلک پائی نہیں جاتی

شراب احمری کا جام وہ بھی دستِ رنگیں سے
طبیعت خود بہک جاتی ہے بہکائی نہیں جاتی

درِ محبوب پر مانوس سجدے تو کئے صدہا
مگر پھر بھی تمنّائے جبیں سائی نہیں جاتی

محبت میں دیا دل کو فریبِ امتحاں برسوں
امیدوں کا رہا مرکز کسی کا آستاں برسوں

دلِ مایوس کا ہے شغل ماتم آرزوؤں کا
محبت میں رہا ہوں آپ اپنا نوحہ خواں برسوں

تصور میں مخاطب کر کے میں نے اہلِ گلشن کو
قفس ہی میں منائی یادگارِ آشیاں برسوں

مصیبت کا مری کوئی تصوّر کر نہیں سکتا
رہی وقفِ غم و اندوہ جانِ ناتواں برسوں

ہزاروں انقلاب آئے گئے مانوس دنیا میں
گزاری زندگی رو رو کے زیرِ آسماں برسوں

ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھ چکے ہیں
ٹوٹا گیا سو بار یہ گھر دیکھ چکے ہیں

اب غم کا اثر ہوتا ہے دل پر نہ خوشی کا — ہر رنگ کی ہم شام و سحر دیکھ چکے ہیں
کیا ان پہ گزرتی ہے انھیں سے کوئی پوچھے — جو تم کو کبھی ایک نظر دیکھ چکے ہیں
تدبیر پہ غالب رہی تقدیر ہمیشہ — ہم پھوڑ کے سو بار یہ سر دیکھ چکے ہیں

آرام کے معنی ہی نہیں دہر میں کچھ بھی
ہر رنگ میں ہم کر کے بسر دیکھ چکے ہیں

زمانہ اس کا مخالف ہے، تم بھی بدظن ہو — بتاؤ جائے دلِ خانماں خراب کہاں
ہوں انقلابِ زمانہ کی آخری تصویر — شہیدِ یاس ہوں، اب حسرتِ شباب کہاں
بقدرِ ظرف سہی، سرفراز بھی تو کریں — وہ دیر سے سامنے آتے ہیں بے نقاب کہاں
شکارِ تیرِ حوادث ہے زندگی لیکن — وفا پسند طبیعت میں انقلاب کہاں
تمام عمر یہ روتی رہی مصیبت میں — ہماری آنکھ کہاں اور لطفِ خواب کہاں
نیا نیا یہ ستم اور مصیبتیں تازہ — یہ زندگی ہے تو جاتا ہے اضطراب کہاں
ہزاروں درس ہر اک لمحۂ حیات میں ہیں — نظر سے آپ کی گزری ہے یہ کتاب کہاں
دلِ حزیں کی مصیبت کہوں تو کس سے کہوں — مجھے سمجھتے ہیں وہ قابلِ خطاب کہاں
ہر ایک شعر میں مانوس آپ بیتی ہے — نوائے درد ہے یہ، نغمۂ رباب کہاں

ہماری زندگی کا نام اک سعئ مسلسل ہے
سکوں حاصل ہو جس منزل پہ اس منزل سے آگے ہیں

کیوں خوشی سے زندگی نا آشنا رکھی گئی
بات اتنی سی بھی محشر پر اُٹھا رکھی گئی

جادۂ غم سے نہ ہٹ جائیں شہیدانِ ستم
اس لیے محفوظ رودادِ وفا رکھی گئی

ان کی قسمت میں مسرّت زندگی کی رفعتیں
میرے حصّے میں زمانے کی بلا رکھی گئی

صرف مجبوری ہی مجبوری ہے آزادی کہاں
زندگی ہے جب اسیرِ مدعا رکھی گئی

آپ سے فریاد کس اُمید پر کرتا کوئی
جبکہ بیگانہ اثر ہی سے دعا رکھی گئی

شعاعِ حُسن رنگیں ہر طرف تھی ہیچ میں دل تھا
دیارِ عشق میں کیا کیا سرور و کیف حاصل تھا

دلِ پر آرزو کی قدر کیوں ہوتی نہ نظروں میں
کہ یہ کچھ بھی نہ ہو پر آپ کے رہنے کے قابل تھا

جو اُمیدِ وفا کرتی نہ دل کی ہمت افزائی
تو جینا حُسن کی سنگینیوں میں سخت مشکل تھا

تمہاری دل بری کی مختصر روداد اتنی ہے
مرے پہلو میں اب داغِ تمنا ہے کبھی دل تھا

نگاہِ حُسن کا اعجاز ہے یا عشق کی سازش
کہیں مانوس دل مانوس ہو جانے کے قابل تھا

عشق کو پردے ہی پردے میں نہ رسوا کیجئے
دردِ دل کو درد کی نظروں سے دیکھا کیجئے

حسن کی معصوم فطرت کو نہ رسوا کیجئے
دیکھئے کافر نگاہوں سے نہ دیکھا کیجئے

روح مضطر ہی ہے تسکین دل کیا کیجئے
نالۂ غم ہر ایک ارمان و تمنا کیجئے

اک زمانہ ہو گیا دل کی فضا خاموش ہے
جاں فزا نغموں سے پیدا ایک دنیا کیجئے

عشق کی مجبوریاں اب رسِ عبرت بن گئیں
ایک ننگِ آرزو کو یوں نہ رسوا کیجئے

ایک ہی صورت ہے اب تسکین کی اور کچھ نہیں
نالۂ غم مانوس ارمانوں کی دنیا کیجئے

مرگ و حیات بھی تو اب باعث ننگ ہو گئیں
میرے لئے خدا سے اب کوئی دعا نہ کیجئے

آہ مزید غم کی اب تاب نہ لا سکوں گا میں
واقفِ ظرف دل ہیں آپ اب تو جفا نہ کیجئے

آپ مریض عشق کو حال پہ اُس کے چھوڑیئے
تلخ ہو اور زندگی ایسی دوا نہ کیجئے

خوب کیا مٹا دیا اُس کا مجھے ملال کیا
باقی ہو کچھ تو اور بھی فکر ذرا نہ کیجئے

اُٹھ نہ سکا یہ بارِ غم، راہ میں گر پڑا ہوں میں
کشتۂ روزگار پر آپ ہنسا نہ کیجئے

انجام پہ رونا کفر یہاں جیسے بھی جیو، جینا ہو گا
گھبرا کے یہ سوچا، مر جاؤں، مجبور تھا ایسا ہو نہ سکا

ماضی کا فسانہ نوحۂ غم اور حال پہ مایوسی طاری
دو روز میں سب کچھ دیکھ لیا اپنا بھی تو اپنا ہو نہ سکا

کلیوں کا تبسّم نغمۂ گل، افسردہ دلی کو کیا کہئے
افسوس مسرّت کا باعث، کوئی بھی تماشا ہو نہ سکا

تو ضبط نہ بیچارے سے ہوا، دم توڑ دیا آخر دل نے
مانوس خدا کی بستی میں کوئی بھی کسی کا ہو نہ سکا

دل کی بساط ہی تھی کیا، خانہ خراب ہی سہی
شکر ہے، آپ تو ہیں خوش، جینا عذاب ہی سہی

حُسنِ خیال کے مزے، کافی ہیں زیست کے لئے
سامنے آئیں بھی تو وہ، مُنہ پہ نقاب ہی سہی

حاملِ داستاں ہر ایک لمحۂ زندگی تو ہے
آرزوئے دلِ حزیں نقش بر آب ہی سہی

ہزار نفریں اگر گئی ہو نظر ترے آستاں سے آگے
میں دیکھنا چاہتا نہیں ہوں کچھ اور اس گلستاں سے آگے

کسی کی پیہم ھبیتیں یہ، کسی سے اب منحرف نہ کر دیں
کسے پکاروں کہ اُٹھ رہا ہے دھواں سا کچھ آشیاں سے آگے

تری نگاہوں کے میں تصدق بچا لیا دل کی رہبری سے
مذاقِ ہستی نہ بڑھ سکا تھا حدودِ حُسنِ بتاں سے آگے

نگاہ اتنی بلند پائی تری محبت میں کیا کہوں میں
پئے سکونِ دلِ حزیں اب تلاش ہے لامکاں سے آگے

عجب کشمکش، اضطراب آ کے دیکھو
مری زیست کو بے نقاب آ کے دیکھو

محبّت کی دُنیا میں خاک اُڑ رہی ہے
شکستہ ہیں چنگ و رباب آ کے دیکھو

نظامِ محبّت میں ہے برہمی سی
ہے مدھم شبِ ماہتاب آ کے دیکھو

سُنا ہوگا مانوس کا نام تم نے
وہی ہے یہ خانہ خراب آ کے دیکھو

رکھ کے ہر ایک در پہ سر بخت کو آزما چکے
ایک ہی گیت عمر بھر سیکڑوں دُھن میں گا چکے

جادۂ غم سے عشق میں جن کے قدم ہٹے نہ تھے
راہِ وفا میں سینکڑوں بار شکست کھا چکے

اب مشکلاتِ زیست کو آساں نہ کیجئے
اک تنگیِ غم کی موت کا ساماں نہ کیجئے

دُنیا مذاقِ درد سے بیگانہ ہو گئی
ظاہر کسی پہ حال پریشاں نہ کیجئے

مانا کہ ان کے عہد میں جینا وبال ہے
خودداریِ ضمیر کو قرباں نہ کیجئے

مانوس مشقِ شعر و سخن ہے انیسِ غم
اس محفلِ خیال کو ویراں نہ کیجئے

پھر انقلاب محبت میں کوئی آئیگا　　نگاہِ لطف اِدھر بار بار ہوتی ہے

گو صبر شکن ہے لمحۂ غم، اظہارِ تمنا کیا کرتے
سب کچھ جو سمجھتا ہے اس سے تقدیر کا شکوہ کیا کرتے
تشریف نہ لائے خوب کیا ہونی کے رہا جو ہونا تھا
اور آپ بھی اک بیکس کے لئے تکلیف گوارا کیا کرتے
جو آئی مصیبت جھیل لی وہ اور شکر کیا خاموش رہے
تعریف کے پردے ہی میں سہی ہم آپ کو رسوا کیا کرتے

فریب تماشا سے واقف ہوں پھر بھی　　اک آباد دنیا کئے جا رہا ہوں
یہ بزمِ فریبِ محبت سلامت!　　خوشی کے عوض غم لئے جا رہا ہوں
دعاؤں کا انجام گو سامنے ہے　　بہرحال سجدے کئے جا رہا ہوں
مجھے ننگ انساں وہ مانوس سمجھے
میں اپنی سی لیکن کئے جا رہا ہوں

مری محبت کے رات دن میں کوئی بھی لمحہ نہیں خوشی کا
نفس سمجھتے ہیں جس کو ہمدم وہ ایک نوحہ ہے زندگی کا

محبت میں سبھی کو فخر یہ حاصل نہیں ہوتا — ہر اک دل عشق تیرِ ناز کے قابل نہیں ہوتا
جب اتنی بات بھی ممکن نہیں تو اور کیا ہوگا — میں جیسا چاہتا تھا آہ! ویسا دل نہیں ہوتا
وہ کوئی اور طاقت ہے جو پہنچاتی ہے منزل تک — شہیدِ جستجو دل رہبرِ کامل نہیں ہوتا
فریبِ حسن کی نیرنگیاں اس حد کو پہنچی ہیں — کسی کو دیکھ کر بھی مطمئن یہ دل نہیں ہوتا
نہیں ہوتا ہے جب کوئی تو ان کی یاد ہوتی ہے — محبت میں کبھی سونا دیارِ دل نہیں ہوتا

کہسار پر گھٹا کیا برسائی جا رہی ہے — تاریخ حسرتِ دل دہرائی جا رہی ہے
ناکامِ آرزو پر یہ آنسوؤں کے قطرے — در پردہ آتشِ غم بھڑکائی جا رہی ہے
یہ سانحہ ستم ہے، یہ واقعہ قیامت — اک ننگِ زیست ہستی ٹھکرائی جا رہی ہے
ہر گام پر نئی اک افتاد دیکھتا ہوں — کیا چیز ہے محبت سمجھائی جا رہی ہے
بزمِ جہاں میں اکثر ڈھلتے ہیں جام رنگیں — اک نامراد ہستی ترسائی جا رہی ہے
ہوں منتظر کسی کا آتا نہیں سمجھ میں — مانوس کیوں طبیعت گھبرائی جا رہی ہے

گو ساری خدائی میں کوئی سننے کے لئے تیار نہیں
ہم باتوں ہی باتوں میں اپنا افسانہ سنائے جاتے ہیں
انجام سے پہلے ہی مجھ پر روتی ہیں تمنائیں دل کی
دکھ درد کے بادل رہ رہ کر ماحول پہ چھائے جاتے ہیں
اب سن کے ہمارے نام کو وہ کہتے ہیں کہ ہم واقف ہیں
ہم ہیں کہ اشاروں پر اُن کے اپنے کو مٹائے جاتے ہیں
اس موت کی قیمت کچھ بھی نہیں ہر چھوڑ کے مرنا کیا معنی؟
جو کام تھا آساں اُس کو بھی دشوار بنائے جاتے ہیں

مٹ گیا چمن ہی جب سب کو صبر کر بیٹھے
آسماں کے پردے میں ذکرِ آشیاں کیوں ہو

دو ہی دن میں زندگی مانوس کیا کیا بن گئی
اب تو اپنوں کی بھی نظروں پر تماشا بن گئی
کاش بزمِ حسن میں تیغِ غم سے مل جاتی نجات
ظرفِ دل کی ممتحن ہر موت جھپا بن گئی
ہو چکیں نذرِ تغافل عشق کی خودداریاں
ہستیٔ مانوس آخر ننگِ دنیا بن گئی

سجدہ کیا جہاں جہاں طور کا ہی وہاں گماں
رہتا ہے جلوہ گر کوئی میری جبینِ ناز میں
سجدے کروں ہیں اور کو وہم و گماں سے دُور ہی
کوئی نہیں سوا ترے دیدۂ امتیاز میں

ہمتِ ذوقِ غم بڑھائے جا　　زندگی اک حسین خواب ہی سہی
اعترافِ شکستِ ظرف، غلط!　　یعنی اک اک قدم عذاب ہی سہی
کوششِ خام، زندگی بن جائے　　حُسنِ محتاط، بے نقاب سہی
رہ گئی لاج تنگ ظرفی کی　　غم نہیں تو غمِ شراب ہی سہی
بخششِ خُدا اس کی مرضی ہے
جُرمِ مانوس بے حساب ہی سہی

شراب و شعر میں ڈوبی بصد ناز و ادا اُٹھی
سیرِ کہسار پھر توبہ شکن کالی گھٹا اُٹھی

برستی ہے جوانی، نور کے چشمے اُبلتے ہیں
قدم رکھتے ہی ان کے بزمِ ہستی جگمگا اُٹھی

شہیدِ کاوشِ غم، اکتسابِ زندگی کر لے
پئے تکمیلِ حسرت وہ نگاہِ فتنہ زا اُٹھی

مری بربادیوں کی داد دیں گے آہ! ناممکن
سُنا ہے آپ ہی کے عہد میں رسمِ وفا اُٹھی

رہینِ لُطفِ سماعت جو عمر بھر نہ ہوئیں
وہ بے نیاز صدائیں سلام کہتی ہیں

زمینِ دل پہ بسی ہیں جو بستیاں غم کی
وہ یادگار جفائیں سلام کہتی ہیں

تمام عمر نہ نکلیں جو حسرتیں یعنی
جفا پرست خطائیں سلام کہتی ہیں

نہیں ہے آپ کی نظروں میں جس کی کچھ قیمت
وہ ننگِ زیست وفائیں سلام کہتی ہیں

گئیں جو بابِ اثر تک نہ عمر بھر مانوس
وہ دل فریب دعائیں سلام کہتی ہیں

ناکامیٔ پیہم کا عالم، ہر وقت یہی تھا پیشِ نظر
کھل جائے کہیں دل کا نہ بھرم آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نہ سکے

دل اور جگر پر کیا گزری، چھوٹی سی کہانی تھی لیکن
وہ گریۂ پیہم کا عالم، وہ سُن نہ سکے، ہم کہہ نہ سکے

اس شعر و سخن کے پردے میں کہنے کی بہت سی باتیں تھیں
مانوس ہمیں جو کہنا تھا، کہنے کو تو چاہا کہہ نہ سکے

کیا طبیعت اُن کی مجھ سے بدگماں ہوتی گئی — میری اک اک بات اک اک داستاں ہوتی گئی
رخصتِ جانِ چمن، اک سانحہ ہے زیست کا — رفتہ رفتہ کم بہارِ آشیاں ہوتی گئی
وہ نگاہِ حُسن، پیغامِ محبت لازوال — سجدہ گاہِ شوق خاکِ آستاں ہوتی گئی
زندگی کا مرحلہ دشوار تر ہوتا گیا — ہائے کیا سے کیا نگاہِ امتحاں ہوتی گئی

سرِ بزم ذکرِ محبت نہ آئے — قیامت سے پہلے قیامت نہ آئے
سلامت رہی، تلخیٔ زیستِ پیہم — مجھے راس یا رب محبت نہ آئے
قدم وادیٔ عشق میں رکھنے والے — بہرحال لب پہ شکایت نہ آئے

جفائے پیہم کا ذکر کیا اب وہ دل پہ صدمے گزر رہے ہیں
یہ زندگی زندگی ہی کوئی کہ قبل مرنے کے مر رہے ہیں
خلاف مرضی کے اب تو ان کی قدم اُٹھانا گناہ ٹھہرا
اسی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں، جو کچھ وہ کہتے ہیں کر رہے ہیں
خود اپنے ہاتھوں تباہ ہونا، نہیں بتائے گا کوئی اسکو
یہ اُن سے پوچھو کہ جو ہمیشہ شہید تیرِ نظر رہے ہیں

روز دل کے ساز پر تازہ غزل گائی گئی
اک کہانی مختلف لفظوں میں دہرائی گئی
یہ تجاہل عارفانہ اور اس پر عمر بھر
روز پیمانِ محبت کی قسم کھائی گئی
تلخی و غم کے ہزاروں مرحلے تھے عشق میں
ہم غریبوں سے ہمیشہ خاک چھنوائی گئی
جی رہا ہی اک پریشاں حال کیوں تیرے بغیر
یہ حقیقت ہی مگر اب تک نہ سمجھائی گئی
حسرتوں کا ذکر کیا میری جبینِ شوق کیا
حیف تیرے آستاں پر بھی یہ ٹھکرائی گئی
بد نصیبی کا گلہ مانوس کس سے کیجئے
روز اک تازہ مصیبت سامنے لائی گئی

قدم اپنا مانوس رکھنا سنبھل کر   مخالف چمن کی ہوا ہو رہی ہے

مؤرخِ زندگی لکھے کیا، زبانِ خامہ بھی دم بخود ہے
کہاں رہی سرزمین دل پر کوئی بھی اب یادگار اپنی
ہے جن کے مانوس اک اشارے پہ زندگی کی بہار پنہاں
انھیں کہانی سنانے آیا ہے اک غریب الدیار اپنی

بعض ایسی مصیبت عشق میں ہے ٹالے سے بھی وہ ٹلتی ہی نہیں
اس دھوپ کو آخر کیا کہیے، اک حال پہ ہے ڈھلتی ہی نہیں
اُفتاد کچھ ایسی پیش آئی، کوئی بھی انیسِ غم نہ رہا
اس فکر رسا ہی کو دیکھیں، اک گام بھی اب چلتی ہی نہیں
یہ وقت بھی جیتے جی دیکھا، اس حال میں بھی دیکھا نہ گیا
ویرانۂ دل میں شمعِ الم، خاموش ہے اب جلتی ہی نہیں

ہر گلی کوچہ میں پھرتا ہے بھکاری کی طرح   آپ کی ہوتی ہے توہین کہ دیوانے کی

آپ کی مرضی پہ موقوف ہی مرضی میری
کثرتِ غم سے طبیعت نہیں اکتانے کی

دل کی ہر ایک آرزو، دل ہی میں گھٹ کے رہ گئی
سازِ نفس کو کیا کہوں، ٹوٹ گیا بہار میں
جس کی اُٹھان اک ستم، جس کا شباب ایک قہر
پھر وہ جھلک عیاں ہوئی وسعتِ قلبِ زار میں

یہ فریبِ منزلِ زندگی، اور تلاشِ راہنما نہیں
کہ وفا پرست، انیسِ غم، کوئی دل کے بعد رہا نہیں
مری زندگی کا ہر ایک دَور، فریبِ حُسنِ خیال تھا
یہ نظر، نظر سے ملی تو کیا، کبھی دل تو دل سے ملا نہیں
مجھے بزمِ ناز میں پیئے یہ پیئے، نہ بڑھا یہ جامِ جہاں نما
کہ علاجِ تلخیٔ زندگی، یہ شرابِ ہوش رُبا نہیں
یہ فریبِ ہمت سے بے نیاز، بھٹک رہا ہے اِدھر اُدھر
مرے کاروانِ خیال کا ابھی کوئی راہ نما نہیں

یہ شکستہ خانۂ آرزو کا سہاگ جتنا نفس سہی
وہ چراغِ حُسنِ مآلِ غم ابھی جل رہا ہے بجھا نہیں

حسرتِ اُمیدِ دل، انجامِ پروانہ سہی
زندگی کی جستجو ہے، خوابِ دیوانہ سہی

جذبۂ صادق سلامت جستجوئے ذوقِ دل
راہِ کعبہ بن رہی ہے تو راہِ بت خانہ سہی

عمرِ دو روزہ کی حسرت سب کو راس آتی نہیں
صبحِ غم خانہ سے بہتر شامِ غم خانہ سہی

میری نظروں میں تو اب سرمایۂ تسکیں ہے یہ
ہر حقیقت ہو غلط ہر بات افسانہ سہی

کچھ تو راس آئے مجھے مانوسِ غم ہو یا خوشی
صبحِ میخانہ نہیں تو شامِ میخانہ سہی

یہاں ہوتا ہے پیہم خون اُمیدوں کے پردے میں
یہ ظاہر پاک دل کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

نظر کیا چیز آئی اضطرابِ دل کی کروٹ میں
پریشاں کچھ نگاہِ دوربیں معلوم ہوتی ہے

حیاتِ نو کی تابانی جبینِ یوم پر فسردہ پر
محبت کی وہی صبحِ حزیں معلوم ہوتی ہے

نقوشِ حسرتِ دل آئینہ ہے عہدِ ماضی کا
یہ دُنیا اب وہ دُنیا ہی نہیں معلوم ہوتی ہے

نمائش گاہ عالم میں محبت کی نمائش کیا
کہ ننگِ بندگی خاکِ جبیں معلوم ہوتی ہے

لباسِ نو پہن کر عشق میں پھر زندگی آئی
مگر یہ بھی مصیبت آفریں معلوم ہوتی ہے

چراغ اُمید کا مانوس جب تک گھر میں روشن ہے
رہائی اس کشاکش سے نہیں معلوم ہوتی ہے

پوچھتے ہیں ہر قدم پر رہنمائی دل سے ہم
تھک گئے ہیں اور کتنی دُور ہیں منزل سے ہم

موجِ بحرِ غم سلامت کشتیٔ اُمیدِ دل
کون پوچھے دُور یا نزدیک ہیں ساحل سے ہم

چار دن کی کامیابی کیا کہیں کیا بن گئی
عمر بھر اچھا بھلا رہتے تھے دور ہی منزل سے ہم

یہ مسافت زندگی کی طے نہ آخر ہو سکی
ناپتے ہی رہ گئے پیمانۂ مشکل سے ہم

کچھ نہیں مانوس تو حُسنِ تصوّر ہی سہی
حال کی دُنیا بسا لیں خوابِ مستقبل سے ہم

تجدیدِ ذوقِ حُسن کا ساماں لئے ہوئے
آئی بہار، دعوتِ عصیاں لئے ہوئے
پھر کاوشِ شباب نے دیوانہ کر دیا
ہر گُل ہے اک حقیقتِ عریاں لئے ہوئے
محفل میں تیری مجمعِ اہلِ ہوس سے دُور
بیٹھے ہیں ہم بھی کاسۂ ارماں لئے ہوئے
مانوس زندگی کی کہانی طویل ہے
دل سوگوار ہے غمِ انساں لئے ہوئے

خموش افسردہ دل کے گوشوں میں یادِ عہدِ شباب کی ہے
خُمارِ غم کوش میں ابھی تک جھلک خیالی شراب کی ہے
گلوں کی بستی ہو وقفِ ماتم، اداس بزمِ طرب کا عالم
جہاں میں پھیلی ہوئی کہانی یہ، ایک خانہ خراب کی ہے
ہجومِ افکار و چشمِ حیراں، عجیب عالم ہے زندگی کا
نہ اب نہ خواہش گناہ کی ہے، نہ فکر کارِ ثواب کی ہے

نگاہِ ناز کی رنگینیاں ارے توبہ! — سب اپنی دُھن میں ہیں کوئی بھی کامیاب نہیں
وہاں قبول ہوئیں التجائیں عالم کی — بس ایک میری دعا ہے کہ مستجاب نہیں

جفائے حُسن کا احساس شکوۂ نامرادی کا — محبت کا پُجاری ہو کے یہ گمراہیاں کیسی
نہیں کم دولتِ کونین سے غم آشنا دل بھی — خوشی کی جستجو مانوسؔ زیرِ آسماں کیسی

دُکھ درد کے ماروں کی دُنیا دیکھی ہی نہیں جاتی ہم سے
جس درد سے سب بیگانہ ہیں، ہم درد وہ تنہا رکھتے ہیں
ایک ایک گھڑی، اک جُرم سہی، انجام جو ہونا ہے ہو گا
ہم پیشِ نظر اس دُنیا سے، اک اور بھی دُنیا رکھتے ہیں
مانوسؔ محبت کا حاصل، دُنیا کے لئے اک عبرت ہے
بیتے ہوئے دن کی یاد ہے اب اور اس کے سوا کیا رکھتے ہیں

ظرفِ بے مایہ کو پیہم عشق میں رُسوا نہ کر — یعنی ان کو دیکھ کر، اپنی طرف دیکھا نہ کر
یہ دمِ پرواز کیسی آشیانے پر نظر — قوتِ پرواز کو مُرغِ سحر رسوا نہ کر

چند لمحے کی خوشی کیا، ایک بے معنی فریب
زندگی انجام ہے، انجام کی پروا نہ کر

زندگی کی نامکمل داستاں جائے گی
حسرتِ امروز کو منت کشِ فردا نہ کر

اک کہانی نامکمل، اک فریبِ ناتمام
عمر دو روزہ یہی تھی، یہ نہ کر ایسا نہ کر

زندگی کا اب کوئی مانوس پس منظر نہیں
دل کا اس گھرتے ہوئے بازار میں سودا نہ کر

بہار جس کی اینیں غم تھی اسی کو ویران دیکھتے ہیں
کلیجہ آتا ہے منہ کو جس وقت گھر کو سنسان دیکھتے ہیں
ہوا زمانے کی ناموافق، نہ رات کو اور نہ دن کو راحت
یہ ماتمِ مرگِ آرزو کیا، خدا کی ہم شان دیکھتے ہیں
دل آپ بیتی سنائے کیسے، کہاں سے الفاظ لائے ایسے
عجیب عالم ہے، کشمکش میں غریب کی جان دیکھتے ہیں

کہتے کہتے مدعا دل کی زباں خود رک گئی
حسن کی معصوم فطرت کو پریشاں دیکھ کر

موت کا پیغام عرضِ مدعا ثابت ہوا
دل کا عالم کیا کہوں ان کو پریشاں دیکھ کر

مانوس خوش بہت ہیں کسی کی جفا سے ہم
جانچیں گے رہِ زیست کو اپنی وفا سے ہم

انجامِ کارِ کشتیٔ دل غرق..... ہو گئی
کس درجہ بے نیاز رہے ناخدا سے ہم

دو دن کی زندگی کو سمجھتے ہیں زندگی
رہتے ہیں بے نیازِ غمِ ماسوا سے ہم

پھر ایک انقلاب کی زد پر ہے زندگی
واقف ہوئے نہ اب بھی فریبِ دعا سے ہم

عنایت کی کبھی خواہش نہ کی افسوس! اس پر بھی
کسی سے پرسشِ جرمِ وفا ہوتی ہی رہتی ہے

نامکمل رہ گیا افسانۂ مرگِ اُمید
عمر بھر ایسی ہی کچھ صورت بہم ہوتی رہی

حشرِ صبحِ زندگی ہی کم نہ تھا تکلیف دہ
اور اس پر اک بلا ہر شامِ غم ہوتی رہی

بے نیازِ آرزو کی کس طرح گزری نہ پوچھ!
زندگی ممنونِ تجدیدِ الم ہوتی رہی

انقلاب آیا گئے مانوس ہم عشق میں
آرزوئے دل ہمیشہ بیش و کم ہوتی رہی

شہیدِ حُسنِ فریبِ ہم خیال کیا کیا لئے ہوئے ہے
کبھی نہ پوری جو ہو تمنا وہی تمنا لئے ہوئے ہے

چمن کی بے کیفِ زندگی پر یہ ہنس کے نگاہ ڈالی
گُلوں کا کیا ذکر یہی تھی خمارِ صہبا لئے ہوئے ہے

تمہاری مرضی پہ فیصلہ ہے، مآل جو کچھ ہو زندگی کا
یہ ننگِ ارمان و شوق و حسرت تمہارا سودا لیے ہوئے ہے

یہ نقشِ مانوس حسرتوں کے مٹائے مٹتے ہیں کب کسی سے
تباہ ہو کر بھی ہستیٔ دل وہی تمنا لئے ہوئے ہے

کوئی جانبِ شبنم کی ہو فریبِ امتحاں کب تک
یہ ہے آخرا بیانِ وہم میں سیارگانِ زر کب تک

لگا دے آگ اپنے ہاتھ سے اپنے نشیمن کو
یہ گلچیں کی خوشامد اور خیالِ باغباں کب تک

طلسمِ زندگانی ٹوٹ کے رہ جائے گا اک دن
نہ آئے گی خبر لینے کو مرگِ ناگہاں کب تک

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے خدا کو بھول جاتا ہوں
معین جانا نہیں کوئی خیالاتِ پریشاں کی

آپ کی بات آپکی طرزِ جفا کچھ اور ہے
لطف فریبِ شب کے بعد دن کی فضا کچھ اور ہے

عیش کو ترک کر دیا، مول لی سب سے دشمنی
پھر بھی نگاہِ حسن میں فرضِ وفا کچھ اور ہے

آپ نے غور ہی نہیں اس پہ کیا ورنہ کیا کہوں
نغمۂ غم کا ذکر کیا، دل کی صدا کچھ اور ہے

موت بھی ایک جرم ہے جرم اگر ہے زندگی
گلشنِ کائنات کی اب تو فضا کچھ اور ہے

آہ غریب دل پہ اب تنگ ہے عرصۂ حیات
کشتۂ ناز حسن ہوں میری دعا کچھ اور ہے

قدم رکھنے سے پہلے غور کر لے ساری باتوں پر
بظاہر کام جو آسان ہے وہ مشکل نہ ہو جائے

بہارِ حسن کو منظور ہے پھر جلوہ آرائی
متاعِ صبر نذرِ انقلابِ دل نہ ہو جائے

نظر مجھ سے ملاتے ہی نہیں اور گفتگو کیسی
وہ ڈرتے ہیں کہیں مانوس دل سے دل نہ ہو جائے

بیخودی میں ہی سرورِ عشق کا حاصل مزہ
ہوش آتے ہی طبیعت دوسری ہو جائیگی

بجھ گیا مانوس جب اپنی اُمیدوں کا چراغ
اور کیا کرتا کفِ افسوس مل کر رہ گیا

نہیں ہم تمھیں باوفا کہنے والے
جفا کو کہیں گے جفا کہنے والے

کہیں کھل نہ جائے بھرم ضبطِ غم کا
خبردار! او مدعا کہنے والے

ذرا اک نظر اپنے ماحول پر بھی	سرِ بزم ہم کو بُرا کہنے والے
محبت کی تضحیک ہوتی ہے اس سے	غمِ زندگی کو بلا کہنے والے

یہ بزمِ طرب یہ شرابِ کہن کیا	نہیں تم تو پھر لطفِ شعر و سخن کیا
بہت سی ہیں باتیں مگر مختصر یہ	نہیں کوئی اپنا تو اپنا وطن کیا
نہ پوچھا کبھی آپ نے جیتے جی جب	تو مرنے پہ یہ اہتمامِ کفن کیا

زندگی ہے غم سے بیگانہ ابھی	نامکمل ہے یہ افسانہ ابھی
آ رہی ہے گنگنانے کی صدا	ہوش میں شاید ہے دیوانہ ابھی
آزمائش ہی اگر منظور ہے	سامنے رہنے دو پیمانہ ابھی

دیکھئے مانوسؔ کیا بنتا ہے دل
اک تماشا ہے یہ ویرانہ ابھی

بے محابا آج، اظہارِ تمنا ہی سہی	اب تو جو کچھ ہو مذاقِ عشق رسوا ہی سہی
بات اتنی سی ہے معیارِ وفا قائم رہے	زندگی اہلِ محبت کی تماشا ہی سہی

عہدِ رفتہ کی تلافی ہو نہیں سکتی مگر
چند گھڑیاں زندگی کی نذرِ صہبا ہی سہی
ساکیؔ قسمت، ادائے حُسن سے بیگانہ ہوں
وہ مجھے ایسا سمجھتے ہیں تو ایسا ہی سہی

بہارِ گلہائے نوشگفتہ کی ہم آرزو نہ کرتے
تو پردۂ شعر میں مرتب فسانۂ رنگ و بو نہ کرتے
کسی کی مانوس بدگمانی کا زندگی پر اثر نہ پڑتا
کسی سے بے ربط ہی سہی ہم اگر کوئی گفتگو نہ کرتے

ستم ہے غنچے یہ ناشگفتہ نکل رہے ہیں چمن سے باہر
ہوا نہ اپنا وطن میں کوئی تو کون ہوگا وطن سے باہر
ابھی تو احساس غم کی شدت سے صرف جینا ہی تلخ تر ہے
نہ جانے کن مصیبتوں سے یہ جان نکلے گی تن سے باہر
یہی ہے مانوس زندگی کا وہ سین جس پر ہے ختم سب کچھ
کفن کے اندر رہے جسم خاکی نکر ہیں ارماں کفن سے باہر

مری ہر اک تمنا حاملِ غم ہوتی جاتی ہے
مسرت کی ہی تحریک بھی سم ہوتی جاتی ہے

ہجومِ یاس میں خودداریٔ دل کا خدا حافظ!
متاعِ زیست نذرِ حشرِ پیہم ہوتی جاتی ہے

محبت میں بلند اتنا مذاقِ حسن رکھتے ہیں
ہماری خاکساری رشکِ عالم ہوتی جاتی ہے

یہی مانوس شاید پیش خیمہ ہے تباہی کا
چراغِ آرزو کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

حسن کی معصومیت پر ہو نہ ہلکا سا اثر
اضطرابِ دل میں یہ انداز پیدا کیجیے

لطف اندوز ہوئے سب مرے افسانے سے
کوئی مانوس نہیں عشق کے دیوانے سے

دل کو پیغامِ سکوں ملتا ہے میخانے سے
زندگی ملتی ہے میخوار کو پیمانے سے

اب تو امید کا دامن بھی چھٹا جاتا ہے
تم نے اک بات نہ کی عشق کے دیوانے سے

حسن کی دین ہے یہ عشق کا اعجاز ہے یہ
زندگی ہوتی ہے پیدا مرے افسانے سے

محفلِ سوز میں پہلے ہی اداسی تھی بہت
دردناک اور فضا ہو گئی پروانے سے

شکریہ آپ کا مجبور ہوں لیکن دل سے
اضطراب اور سوا ہوتا ہے بہلانے سے

خانۂ یاس میں کس نے یہ قدم رکھا ہے
تیرگی دور ہوئی جاتی ہے غم خانے سے

اچھی صورت کا پجاری ہوں میں برباد سہی
دلِ مانوسؔ تو مانوس ہے بتخانے سے

افسانۂ دل کیونکر کہئے پامالِ ستم ہوتا ہی رہا
روزانہ نئی تکلیف کا اک سامان بہم ہوتا ہی رہا
دُنیا میں محبّت کی گھڑیاں بے کیف گزاری ہیں میخانے
احساس مسرّت پر غالب ہر حال میں غم ہوتا ہی رہا
افسوس ہی دُکھ کے ماروں کی اب کون کہانی سُنتا ہی
وہ میں ہوں کہ پردے پردے میں مانوسؔ ستم ہوتا ہی رہا

پردۂ صبر میں ہمیں دعوت التجا نہ دے
زہر اگر مفید ہی، زہر سہی دوا نہ دے

چھائی ہوئی ہی تیرگی، غم خوشی کہاں
جو زندگی نظر میں ہی، وہ زندگی کہاں
کچھ یاد کر کے کانپ رہے ہیں دل و جگر
پھر لے چلی ہی جوشش دیوانگی کہاں
ہلکی سی اک جھلک بھی نہیں اب اُمید کی
افسوس لا کے چھوڑ گئی بے کسی کہاں

کیوں سنگِ دو جہاں نہ کہوں اپنے آپ کو
دل میں جو ایک بات تھی تم نے سنی کہاں

دونوں جہاں میں چین کی صورت ہی جب نہیں
پھر اور کام آئے گی یہ بندگی کہاں

مانوس عہدِ حُسن کا اب ذکر ہی فضول
جو خواب میں گزر گئی وہ زندگی کہاں

یہ زیرِ لب تبسم اک نقش بیکسی پر
تنقید کر رہے ہیں گویا وہ زندگی پر

غم سے ابھی پریشاں نازاں ابھی خوشی پر
اترا نہ کوئی پورا معیارِ زندگی پر

یہ امتحاں مسلسل اچھا نہیں ہے شاید
کوئی اتر نہ آئے تنگ آ کے سرکشی پر

مانوس رفتہ رفتہ اب وہ بھی مٹ رہا ہے
جو نقش دیر پا تھا دامانِ زندگی کا

یہ عہدِ ستم تا دیر رہے کچھ روز تماشا اور سہی
منظور یہی جب آپ کو ہے تو خونِ تمنا اور سہی